Vol. 5 No.2 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اردو افسانہ: سماجی، سیاسی و عصری تناظر

ڈاکٹر صباحت مشتاق
لیکچرر, بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد
ڈاکٹر سائرہ بتول
اسسٹنٹ پروفیسر, بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر محمد احمد قادری
ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز, یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

Abstract:

Human history, society and variation in life always reflect in literature. Uniformity and stagnation give rise to meaninglessness not only in life also in fiction. The day-to-day changes and social conditions affect society at the individual and collective levels. Literary creation is considered worthless if it does not reflect contemporary trends and social issues. It is expected from good literature that a glimpse of any particular era should be reflected in it.

In this sense, while transforming into fiction, it not only expanded the subject matter through its requirements and tendencies but also expanded its dimensions. In terms of periods, fiction not only fully absorbed the particular era and its effects, but also accepted the changes in technique, form and structure under the influence of changing times. And at the same time, it went through a variety of style experiments. This article will be analyzed in detail, that how the expression of all these mentioned aspects is seen in fiction, especially in Urdu short story.

ادب اپنے عہد اور اس سے متعلق افراد کے نظریات، خیالات اور تحریکات کا عکاس ہوتا ہے، انسانی تاریخ اور سماج دونوں ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب ہم اُردو افسانے کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کا تغیر ادب کو متاثر کرتا ہے۔ ادب اور سماج ایک ہی سکے کے دو رُخ کہے جاسکتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زندگی میں یکسانیت کا پہلو یا تصور ناپید ہے۔ آئے دن رونما ہونے والی تبدیلیاں اور انقلابات انفرادی و اجتماعی سطح پر فرد اور معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔ تخلیق کار کا تعلق بھی چونکہ سماج سے ہوتا ہے اس لیے وہ ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اس اعتبار سے افسانہ نگاری کی صنف اس حوالے سے ہمیشہ آگے رہی کہ اُس نے بدلتے وقت، اس کے تقاضوں اور رجحانات کے ذریعے نہ صرف موضوعات کو وسعت دی بلکہ اُس کی جہات میں بھی اضافہ کیا۔ ہم اگر ادوار کے اعتبار سے اُردو افسانے کو دیکھیں تو اُس نے نہ صرف مخصوص عہد اور اس کے اثرات کو مکمل طور پر اپنے اندر جذب کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بدلتے زمانے کے زیر اثر تکنیک، ہیئت اور ساخت کی تبدیلیوں کو بھی قبول کیا اور اسلوب کے حوالے سے بھی متنوع تجربات سے گزرتا رہا۔ اردو افسانے کی ابتدا اور نشو نما اگرچہ بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقا میں ہوئی جبکہ افسانہ خود ایک نئے شعور کا اظہار اور نئی دریافت کا نام ہے جو اپنی تہہ در تہہ معنوی خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی اُس پرت کا عکس معلوم ہوتا ہے جس کا ارتقا انیسویں صدی کے یورپ میں ہوا۔

افسانہ نگاری کی ابتدا مغرب میں انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی مگر اردو میں اس کی ابتدا پریم چند سے بھی کچھ پہلے یلدرم کے افسانوں سے کہی جاسکتی ہے، یلدرم اور پریم چند سے پہلے اور ان کے وقت میں بھی کچھ ایسے خاکے اور تحریریں پڑھنے کو ملتے ہیں جنہیں افسانے کے ابتدائی اور غیر شعوری نقوش قرار دیا جاسکتا ہے مگر ان میں افسانے کے تشکیلی عناصر اور لوازمات کو صحیح طور پر برتا نہیں گیا لیکن نصف صدی کے اندر اندر افسانے نے معاشرتی زندگی میں داخل ہو کر بنی نوع انسان کے دُکھ، خوشی،

Vol. 5 No.2 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

الجھن، تفکر اور دیگر سماجی مسائل کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اُنھیں فنی محاسن اور افسانوی اسلوب کے دائرے میں سمو دیا۔ اردو افسانہ ابتدا ہی سے سماجی عناصر کی کار فرمائی سے متاثر رہا ہے۔

"ترقی پسند افسانے نے نہ صرف حقیقی زندگی کی بلکہ عہد نو کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھا اور روایت کا بھی احترام کیا۔"[1]

اردو افسانے کی روایت ہی سماجی رہی ہے۔ یہ اپنے آغاز ہی سے مختلف فکری رویوں کا حامل اور لب و لہجے اور طرزِ احساس کے اعتبار سے دو واضح حصوں میں تقسیم ہو گیا جس میں ایک حصہ رومان اور تخیل کی رنگینیوں میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے جہاں فرد اپنی ذہنی و جذباتی آزادی اور فطری مسرت کے لیے کوشاں دکھائی دیتا ہے جبکہ دوسری طرف بے بسی، مجبوری، نو آبادیاتی نظام سے نفرت، غربت افلاس، عدم طمانیت کا احساس اور دیگر مسائل کو تقدیر ماننے سے گریز، ایک نئے لب و لہجے کو پروان چڑھا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لکھے جانے والے افسانوں کے موضوعات آتش فشاں کی حیثیت رکھتے تھے۔

اردو افسانہ لکھنے والے کبھی بھی اپنے ماحول اور مسائل سے بے گانہ نہیں رہے، اُنھوں نے وقت کی آواز کو ہر دور میں سُنا اور زندگی کے تقاضوں اور مسائل سے اجتناب نہیں برتا۔ بیسویں صدی کے افسانوں کے موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں:

"زندگی کا کھوکھلا پن، رومان اور اس کی حرماں نصیبی مثبت دور زندگی کے مسخ کیے ہوئے کردار اور شخصیتیں ہنگامی اور سیاسی موضوعات، جنس اس کی لذتیت اور اُس کی چیرہ دستیاں، اس کی خام کاریاں سبھی کچھ ابھر کر اردو افسانے میں سامنے آئے۔"[2]

گویا اردو افسانے نے ہر دور کے سماج کو اپنے اندر سموئے رکھا۔ تقسیم کے بعد سماجی رویے تبدیل ہوئے اور عوامی منظر نامے میں بھی واضح فرق دکھائی دیا تو افسانے کے موضوعات میں مزید تنوع اور تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ آزادی کی تحریک اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خون ریزی اور انسانیت سوز رویوں نے حساس تخلیق کاروں کو متاثر کیا جنھوں نے اس قتل عام اور زندگی کے سفاکانہ پہلو پر بہت سی کہانیاں لکھیں۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قدرت اللہ شہاب نے شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ "ہم وحشی ہیں"، سعادت حسن منٹو کا افسانہ "کھول دو"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "نیا قانون" قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "پرمیشر سنگھ" اور قدرت اللہ شہاب کا "یاخدا" کے علاوہ بھی بے شمار کہانیاں اس ہولناکی کی تاریخ رقم کرتی ہیں۔

تقسیم ہند اور فسادات کے بعد خصوصاً 1960ء اور 1980ء کے درمیانی عرصے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی و سماجی منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا، چھوٹی ریاستوں میں سیاسی شعور کی بیداری، جنوبی ایشیا اور افریقہ کی غلام اقوام میں استحصال کے خلاف نئی تنظیموں کا جنم، ویت نام اور فلسطین کے مسائل، بنگلہ دیش اور برما سے مسلمانوں کا انخلا اور ہجرت، افغانستان میں روسی فوج کی مداخلت نے عالمی سطح پر اپنے اثرات چھوڑے تو اس سیاسی و سماجی تغیر کو پاکستان میں بھی ہر سطح پر محسوس کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے ہاں جمہوریت کی ناکامی، مارشل لا کا بار بار لگنا، سقوطِ ڈھاکہ، معاشی و معاشرتی عدم مساوات ان سب کی جھلک اُس عہد کے افسانے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افضال لکھتے ہیں:

"پاکستان میں رونما ہونے والے ہر واقعہ نے بالعموم ہمارے ادب اور بالخصوص اردو فکشن (افسانہ، ناول) پر اثر ڈالا، وہ فسادات کا سانحہ ہو یا ہجرت کا کرب 1958ء کا مارشل لاء ہو یا 1977ء کا مارشل لاء، پاک بھارت جنگ ہو یا سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ، سبھی نے ہماری قومی زندگی کو متاثر کیا۔ ان واقعات سے نہ صرف ہماری تاریخ کا راستہ متعین ہوتا ہے بلکہ ہمارے تخلیقی ادب کا مزاج بھی پروان چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔"[3]

گویا پاکستانی افسانہ نگاروں نے ہر عہد کو اُس کے تمام منظروں کے ساتھ افسانے میں محفوظ کر لیا اور یوں افسانہ اپنے عہد کا ترجمان بن گیا۔ یہ الگ بات کہ ہر تخلیق کار نے سماج کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا مثلاً کچھ نے اپنی تحریروں میں سماج کے مخصوص طبقات کے حوالے سے لکھا کچھ نے دیہی زندگی کی عکاسی کی، کسی نے شہری اور جدید صنعتی زندگی سے جڑے مسائل کو موضوع بنایا تو کچھ نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

Vol. 5 No.2 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

پاکستانی اردو افسانے میں احمد ندیم قاسمی کے ہاں ہمیں بیدی کی کہانیوں سے ملتے جلتے منظر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی معاشی، معاشرتی ناہمواریاں اور انسانی رویوں کے تضادات کے موضوع نظر آتے ہیں۔ پریم چند کی طرح اُنھوں نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تر گاؤں کی زندگی کو پیش کیا ہے جہاں جبر اور ظلم کی چکی میں پستا ہوا کسان، دیہی مزدور اور اس کی زندگی کو انھوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے "چوپال"، "بگولے"، "نیلا پتھر" اور "سناٹا" اُن کے سماجی شعور کی عکاسی کرتے ہیں۔

کرشن چندر اشتراکی فکر رکھنے والے طبقے میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ اشتراکیت چونکہ ایک سیاسی اور معاشی فلسفہ تھا جس کے نظریات کے مطابق غریبوں، مظلوموں کے حق میں آواز بلند کی جاتی تھی اور استحصالی طبقات کے خلاف احتجاج۔ لہٰذا کرشن چندر نے بھی اپنی فکر اور فن کو ان ہی بنیادوں پر استوار کیا، طبقاتی نظام، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کسانوں، مزدوروں کی بے بسی کے ساتھ وہ تمام قوتیں بھی اُن کی نفرت کا ہدف تھیں جو ہندوستان پر سیاسی و معاشی غلامی مسلط کر رہی تھیں۔ ان کا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" ایسی ہی کہانی ہے جہاں صرف ڈیڑھ فرلانگ پر وہ سبھی ناانصافیاں، ظلم، جبر اور طبقاتی تفاوت وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہے اور یہ ڈیڑھ فرلانگ لمبی سڑک پورے ہندوستان کی علامت بن جاتی ہے:

"تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا۔ حرام زادے! صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے۔

لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔ اب سڑک پھر سنسان ہے۔

"سنا ہے جنگ شروع ہونے والی ہے"

کب شروع ہو گی

کب؟ اس کا تو پتہ نہیں مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔

کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر" ۴

کرشن چندر چونکہ اشتراکی نظام کو ہی نہ صرف نجات دہندہ خیال کرتے تھے بلکہ اسے سیاسی، معاشی اور حکومتی سطح پر ایک بہترین نظام سمجھتے تھے اور اسی نقطۂ نگاہ سے وہ سماجی زندگی اور اس کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتے۔ ان کے وہ افسانے بھی جو باقاعدہ شعوری طور پر سیاسی موضوعات کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں بھی کوئی نہ کوئی واقعہ یا مکالمہ یا منظر انگریزوں کے علاوہ ہندوستان کی جھلک ضرور دکھا جاتا ہے۔ مثلاً "ان داتا" قحط بنگال کی روداد تو ہے ہی مگر اس قحط کے دوران حکام، عہدے داروں کی خود غرضیاں، رقص اور بادہ نوشی کی محفلوں کا ذکر ایسے تضادات کو اُبھارتا ہے جو انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہیں:

"ڈرائیور نے اس عورت کی ہتھیلی پر چند سکے رکھے اور کار آگے بڑھائی، کار چلاتے بولا حضور! یہ اپنی بچی بیچنا چاہتی تھی "ڈیڑھ روپے" میں۔

"ڈیڑھ روپے" یعنی "نصف ڈالر میں"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ارے نصف ڈالر میں تو چینی کی گڑیا بھی نہیں آتی۔

آج کل نصف ڈالر میں بلکہ اس سے بھی کم میں ایک بنگالی بچی مل سکتی ہے صاحب۔"۵

عزیز احمد اشتراکی نظریات کے حامل تھے لیکن اُن کی نظریاتی تصویر میں بھوکے ننگے کسان مزدور دکھائی نہیں دیتے بلکہ وہ سیاست، فرقہ پرستی، نوکر شاہی پر طنز کرتے اور اُن کی قلعی کھولتے ہیں۔ "اُن کے افسانوں میں بلکتے انسانوں کی بجائے انٹیلیکچول کردار ہیں جو کافی ہاؤس یا بار روم میں بیٹھے چسکیاں لیتے عالمی و ملکی حالات ڈسکس کرتے ہیں۔"۶

منٹو نے تقسیم کے تناظر میں جو افسانے لکھے وہ دردناک منظر کشی کے لیے نہیں لکھے بلکہ تاریخ کی بے رحمی کا فنکارانہ اظہار ہے:

"منٹو نے فسادات پر کئی افسانے لکھے لیکن یہ صرف فسادات پر نہیں ہیں منٹو نے یہاں بھی انفرادی اندرونی المیہ کو اُبھارا ہے، منفرد اور انوکھے کردار لیے ہیں۔ ان کا تیز گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔"۷

Vol. 5 No.2 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

منٹو کو ہمیشہ انتہا پسند سمجھا گیا لیکن اُس نے جو کچھ بھی لکھا اُس کے پیچھے اُس کی فکر اعتدال پسند تھی۔ اُس نے نہ سامراج کی بربریت کا ڈھنڈورا پیٹا نہ برصغیر کی بے بسی کا دفاع کیا بلکہ اُس نے انسانیت کا اور انسانی فطرت کا مسخ شدہ مکروہ چہرہ بے نقاب کیا۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی فلسطین کے مسئلے نے بھی اہمیت اختیار کر لی۔ پاکستانی ادیب ذہنی اور نفسیاتی طور پر اپنا رشتہ عرب سرزمین سے جوڑے ہوئے تھے اس لیے وہ اس موضوع سے لاتعلق نہ رہ سکے۔ خصوصاً اسلامی و پاکستانی ادب کی تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت اس پر لکھا اور یوں مسئلہ فلسطین ادب کا موضوع بنا اور کئی پہلوؤں سے اہلِ قلم کو متاثر کر گیا جن میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سمیع آہوجہ، قدرت اللہ شہاب اور مظہر الاسلام، یونس جاوید جیسے لوگ شامل ہیں۔

یہ موضوع اگرچہ ہماری زمین پر وقوع پذیر نہیں ہوا مگر یہ ایک تاریخی المیہ ہے جو اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ ادب کا حصہ بنا اور مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں نے اس کی سنگینی کو ابھارا۔

قرۃ العین کے افسانے میں ایک اقتباس دیکھیے۔

> "افق پر سنسان خیموں کے پردے پایہ سموم سے پھٹپھٹا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کرب ناک آواز میں پکارا:
> العطش العطش.....لیکن آواز برابر گونجائی "پھر ایک لرزہ خیز چیز بلند ہوئی "العطش" اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔
> آج خیمہ گاہوں پر پھر بم باری کی گئی ہے۔
> جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔"[۸]

قرۃ العین کے علاوہ انتظار حسین نے اپنے افسانوں "کانا دجال" اور "شرم الحرم" میں اپنے مخصوص اور پسندیدہ اساطیری و علامتی انداز پیغمبروں کی سرزمین فلسطین، بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی اہمیت اور اُن سے اپنی روحانی عقیدت کو واضح کیا، مظہر الاسلام کا افسانہ "زمین کا اغوا" بھی اسی موضوع کا حامل ہے، یونس جاوید کا افسانہ "دوسری کربلا" قدرت اللہ شہاب کا افسانہ "اے بنی اسرائیل" بیروت کے بھوکے ننگے فلسطینی پناہ گزینوں کی بے بسی کی تصویریں ہیں اور یہ وہ موضوعات ہیں جو پرانے ہونے کے باوجود نئے واقعات کا پیش منظر بنتے ہیں اور افسانہ نگاروں کی جذباتی وابستگی کے سبب ادب میں متنوع موضوعات کا باعث ہیں۔ دراصل یہ وہ مسائل ہیں خصوصاً فلسطین کا مسئلہ جو وقت پر حل نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل کا باعث بنا:

> "عصرِ حاضر جس کشمکش سے عبارت ہے اور دنیا ہمارے لیے جن مسائل میں بٹی ہوئی ہے ان کی نوعیت سیاسی اور سماجی ہو یا ثقافتی و ادبی فلسطین کا حوالہ کہیں نہ کہیں درمیان میں آ جاتا ہے۔"[۹]

پاکستان میں جو دو مارشل لا لگے ان میں پہلا مارشل لا سماجی و ادبی سطح پر کوئی بڑی ہلچل پیدا نہ کر سکا البتہ اس کے بعد کے دونوں مارشل لا مزاحمت اور ردِ عمل سے دوچار ہوئے اور مزاحمتی ادب تخلیق ہوا۔ پھر یہ مزاحمت علامت اور تجرید کے پیرائے میں ظاہر ہونے لگی تو زندگی کو ایک نئے اور وسیع تناظر میں دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا:

> "نئے اردو افسانے نے زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی روایت قائم کی اور اس کے لیے اس نے نہایت توانا نامیاتی اسلوب اور ڈکشن کو استعمال کیا جس میں نئے موضوع و کردار کو زندہ پیکروں میں مجسم کرنے والی پوری صلاحیت اور اس کے اندر مرئی قوت کا ایک بے پایاں استدلال اور وسعت موجود تھی۔ چنانچہ معنیاتی انسلاکات و استدراک کے لیے استعاراتی، علامتی و تمثیلی اور پیکری تہ در تہ محاکات کا تخلیقی محاکمانہ نئے افسانے کے اسلوب اور بنت کا حصہ بنا۔ معمول کی لفظیات کے استعمال کے انکار سے نئے افسانے کی نئی لفظیات کا ایک نیا ذخیرہ مہیا کیا۔ یہ سارے عناصر مل کر افسانے کو اظہار کے لیے ایک وسیع کینوس مہیا کرتے ہیں۔"[۱۰]

Vol. 5 No.2 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اس تناظر میں سب سے اہم افسانہ نگار انتظار حسین ہے۔ انتظار حسین کی کہانیاں انسان کے خوف اور تنہائی کی کہانیاں ہیں۔ ان میں براہِ راست اگرچہ مزاحمت اور جبر کا حوالہ محسوس نہیں ہوتا مگر مگر مارشل لاء کے دور میں تخلیق ہونے والے ادب میں موجود کرب اور خارج سے فرار، فرد کا نصب العین سے ناآشنا ہونا اور سایوں کے تعاقب میں رہنا یہ سب مارشل لا کا شاخسانہ کہی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح انور سجاد کی ساٹھ کی دہائی میں لکھی گئی کہانیاں اپنی علامتوں، استعاروں اور امیجز کی ذو معنویت کے حوالے سے ایوب خانی مارشل لا کے اثرات کی حامل نظر آتی ہیں۔ مثال دیکھیے:

"میں شہر میں ہوں اور میرے پیچھے سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس ہے جو انچ انچ پر میری بولے رہی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں رہ نہیں سکتا کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ میرے ماتھے پر لیبل چسپاں نہ کر دیں۔"''

مارشل لاء عوام خصوصاً تخلیق کاروں کے لیے ایک ایسا سانحہ تھا جس میں اُن پر ایک نظام جبر اًمسلط کر دیا گیا تھا اور اس نظام کے خلاف اُٹھائی گئی آواز غداری کے مترادف تھی، بقول طاہرہ اقبال:

"مارشل لا کے ابتدائی دنوں میں خوف اور حیرت کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ زبانیں گنگ سی رہ گئیں۔ پکڑ دھکڑ اور فوجی رعب اور مارشل لا کے اندھے قوانین نے بھی سہا دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک خوش فہمی کا عنصر بھی موجود تھا اسی لیے پہلے پانچ چھ برس کے دوران چھپنے والے رسائل میں واضح احتجاج دکھائی نہیں دیتا۔ علامت کے اخفاء میں ہی احتجاجی رویے گھٹے گھٹے سے موجود ہیں۔"۱۲

۱۹۶۷ء میں جب جبر کے خلاف ردِ عمل سامنے آیا اور مزاحمت بڑھنے لگی تو علامت اور تجرید کھل کر افسانے کی دنیا پر راج کرنے لگی۔ انتظار حسین اور انور سجاد کے علاوہ خالدہ حسین، منشایاد، سمیع آہوجہ، احمد داؤد، احمد جاوید اور رشید امجد نے آمریت کے خلاف قلم اُٹھایا اور کئی ملفوف اسلوب کی حامل کہانیاں جو اُس دور کے جبر کی عکاس ہیں اردو افسانے کی تاریخ کا حصہ بنیں جن میں انتظار حسین کی "آخری آدمی" کے علاوہ "شہر افسوس" کی کئی کہانیاں، انور سجاد کا افسانہ "واپسی"، خالدہ حسین کا آخری سمت، سواری، پہچان، ہزار پایہ اور شہر پناہ، فرخندہ لودھی کا افسانہ "آخری موم بتی"، یونس جاوید "ایک بستی کی کہانی" ایک مخصوص خوف اور دہشت کے تناظر میں لکھی گئی کہانیاں ہیں جو ہر دور کی آمریت کے نتیجے میں پیدا شدہ فضا سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔ خالدہ حسین کی کہانی "سواری" میں پورا شہر ایک غیر مانوس متعفن خوشبو کا شکار ہے جو سڑکوں پر گھومتی ایک سیاہ پردوں والی گاڑی سے آرہی ہے اور ناقابل شناخت ہے۔ مجموعی طور پر ان کی کہانیوں میں زیریں سطح پر ایک خوف موجود ہے جو وجودیت، لایعنیت، بے معنویت اور داخلی تنہائی داخلی احتجاج کی صورت ردِ عمل کے طور پر نظر آتا ہے۔

اس افسانے میں شہر کو جبر کی گرفت میں دکھایا گیا ہے جس میں ڈوبتا سورج ڈوبتے ڈوبتے پورے آسمان کو لہو رنگ کر دیتا ہے اور آخر کار یونہی لہو لہو غروب ہو جاتا ہے۔ تماشائیوں میں تین اجنبی پر اسرار افراد گنگ صورتحال کا شکار، یہ منظر دیکھنے میں محو ہیں اور اب کہانی کہنے والا بھی اس کیفیت کا شکار ہوتا ہے جس میں وہ تین اجنبی مبتلا ہیں:

"بالآخر میں نے اُس معمر شخص کی چادر پکڑ لی اس نے پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی..... اہلِ شہر اس دکھ، دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کاٹتی لہریں مر گئیں۔" ۱۳

عملی سطح پر اگر دیکھا جائے تو آزادئ رائے پر پابندی اور حقوق کا سلب ہونا عام آدمی کا مسئلہ نہیں تھا جبر اور جمہوریت اس کے نزدیک اُس کی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے جڑے ہوئے تھے اور اگر یہ ضرورتیں آسانی سے پوری ہوتیں تو اُس کے لیے مارشل لاء اور جمہوریت یکساں تھے لیکن مارشل لا اور ڈکٹیٹر شپ نے نظام کو سنبھالنے کی بجائے مزید مسائل سے دوچار کر دیا جس نے سیاسی سطح پر ایک بدامنی کو جنم دیا جس سے فکری خلا کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ تخلیق کا سفر خارج سے باطن کی طرف مڑ گیا اور تخلیق میں موضوع کی بجائے فنی اختراعات اور لسانی بحثوں نے اظہار کے انداز کو بدل دیا جس سے ابلاغ کے مسائل پیدا ہوئے۔ یہ دور ادب میں علامتی اور تجریدی تجربات کا دور تھا۔ داخلیت کا رجحان غالب تھا، خوف اور ماحول سے بددلی اور بے زاری جہاں پیدا ہوئی وہیں مارشل لاء کی سختیوں نے ادب میں جمود کی فضا کو جنم دیا۔ اگرچہ علامتی رنگ میں

Vol. 5 No.2 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

بات کہی گئی مگر ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں یہ فضا قائم تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین لڑی جانے والی جنگیں (۱۹۶۵۔۱۹۷۱) بہت سی خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دینے کا باعث بنیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ میں ہونے والی جنگ جو سترہ دن کے بعد بین الاقوامی مداخلت سے رُکوادی گئی پاکستانی قوم میں اپنی زمین سے شدید محبت اور وابستگی کے جذبات کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی کی علامت بنی اور ادب میں تقسیم کے بعد موضوعات کا جو قحط پیدا ہو گیا تھا اب اس میں پھر سے تنوع آنے لگا۔ قومی ادب، پاکستانی ادب جیسی اصطلاحیں سامنے آنے لگیں بقول مرزا حامد بیگ:

"۶ ستمبر ۱۹۶۵ تک ادبی سطح پر خصوصاً پاکستانی افسانہ نگاروں کے لیے یہ مسئلہ چلا آتا تھا کہ اس نئے عہد کو جسے "پاکستان کہتے ہیں کیسے اور کیونکر اپنے شعور کا حصہ بنائیں یا شاید بقول انتظار حسین یہ واردات بڑی تھی اور ہم چھوٹے تھے۔ پاکستان کی صورت میں جنم لینے والی سرزمین سے ہماری نئی نئی رشتہ داری تھی۔ شاید اسی لیے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ تک کے اردو افسانے میں دھرتی کی مہلک بالغ نہ ہوئی تھی۔"۱۴

لیکن ان سترہ دنوں کے طفیل ادب میں نئی علامتیں، استعارے تخلیق ہونے لگے جو کسی خارجی دباؤ، خواہش یا تخلیقی رچاؤ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے تھے اور یوں احمد ندیم قاسمی کا افسانوی مجموعہ "کپاس کا پھول"، غلام الثقلین نقوی کا افسانوی مجموعہ "نغمہ و آگ"، مسعود مفتی کا "رگِ سنگ" جنگ ستمبر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں جن کی تمام کہانیاں وطن کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان میں موجود سب سے بڑی خوبی "پاکستانیت" ہے۔ غلام الثقلین نقوی کہتے ہیں:

"کون ہے جو وطن سے محبت نہیں کرتا؟ زمین کے اس ٹکڑے پر جسے ہم وطن کا نام دیتے ہیں کسی کی کٹیا ہے اور کسی کا محل ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے آشیانے سے تو پرندے بھی محبت کرتے ہیں پھر انسان کی کیا تخصیص..... کوئی بھی قوم وطن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"۱۵

ستمبر کی جنگ نے پہلی مرتبہ ملت سے محبت کا احساس پیدا کیا اور ہجرت کر کے آنے والوں کے زخموں پر وطن سے محبت کا مرہم لگایا۔ یوں جنگ ستمبر جذباتی وابستگیوں کا بڑا حوالہ بنی۔ اسی کے تناظر میں لکھا گیا غلام الثقلین نقوی کا افسانہ "کافوری شمع" ایسی ہی جذباتی وابستگی اور محبت کی روداد ہے:

"ٹینک مست ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے اور حوالدار شیر بہادر کے جوان گرنیڈ لے کر ان کے سواگت کے لیے بڑھ رہے تھے..... یکایک گرنیڈ پھٹے اور ایک بڑھتا ہوا ٹینک رُک گیا۔ اس سے دھویں کے بادل اُٹھے اور آگ کے شعلے نکلے لیکن ٹینکوں کی یلغار جاری رہی..... کئی آتش فشاں پہاڑ یکے بعد دیگرے پھٹے مگر حوالدار شیر بہادر کے مورچے سے ایک بھی ٹینک آگے نہ بڑھ سکا ایک بھی نہیں۔ پھر دھویں کا بادل گہرا ہو کر ساری کائنات پر محیط ہو گیا اور شیر بہادر کے گاؤں میں دھوپ اور بھی نکھر گئی اور قرآن کے اوراق سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور اس کا گھر خوشبو سے لبالب بھر گیا۔"۱۶

۶۵ کی جنگ کے تناظر میں لکھی گئی کہانیاں جنگ کے سترہ دنوں کی روداد کہی جا سکتی ہیں۔ یہ جذباتی اور ہنگامی نوعیت کی کہانیاں ہیں۔ ان کا مقصد جنگ کے مناظر کی تصویر کشی ہیں بلکہ پاکستانی نظریات اور نقطۂ نظر کو سامنے لانا بھی تھا۔ اگرچہ زیادہ تر کہانیاں جو وقتی جذبات کے زیرِ اثر لکھی گئیں فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ درجے کی نہیں تھیں لیکن کچھ بہت اچھے افسانے بھی لکھے گئے جن میں انتظار حسین کا افسانہ "سیکنڈ راؤنڈ"، احمد شریف کا افسانہ "رنگوں کا ڈبہ" انسانی رویوں اور فوجی نفسیات کی عمدہ تصویر ہے۔ صادق حسین کا افسانہ "انسان"، رضیہ فصیح احمد کا افسانہ "خندق کا پودا"، فرخندہ لودھی کا افسانہ "پارینہ"، احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "کپاس کا پھول" جذباتی احساسات اور حب الوطنی کے ملاپے سے گندھے ہوئے اچھے افسانے ہیں جن میں جنگی مناظر کی تصویر کشی اور خون ریزی کی بجائے جنگ سے متاثر افراد کے رویوں اور ردِ عمل کو پیش کیا گیا:

"ہمارے گھر میں خوب صورت ہرے بھرے لان میں کھدی ہوئی خندق مجھے زہر لگتی ہے جیسے کسی حسین جسم پر کوڑھ کا داغ یا جیسے کوئی کھلا ہوا زخم..... ۶ ستمبر کو میری شادی تھی اس سے پہلے میری شادی اپریل میں ہونے والی تھی مگر رن کچھ کے جھگڑے کی وجہ سے نہ ہو سکی۔"۱۷

سانحہ (بنگلہ دیش کا قیام) پاکستانی تاریخ کا سب سے المناک واقعہ ہے جس کی بازگشت برسوں سنائی دیتی رہی جس سے ہماری عسکری اور سول قیادت ہمیشہ نظریں چراتی رہی لیکن اس سانحے کے نتیجے میں جنم لینے والے المیے پچھتاوے اور ماتمی صورتِ حال کو افسانہ نگاروں نے ناقدانہ انداز سے دیکھتے ہوئے تجزیاتی انداز میں اس کا اظہار کیا:

Vol. 5 No.2 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

"مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ زبان کا فاصلہ تہذیب کا فاصلہ ہم نے اس فاصلے کو پاٹنے اور انہیں جاننے کی کوشش نہیں کی نہ انھوں نے ہمیں جانا۔ نہ ہم نے اُنھیں پہچانا، نعیم تلخ سی ہنسی ہنسا۔ بابیل کا بیل تو ایک دوسرے کو جانتے تھے، ان کی زبان ایک تھی، ان کی تہذیب ایک تھی پھر کیا ہوا؟"۱۸

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۱۹۷۷ء کا مارشل لا ملکی تاریخ میں جبر اور دہشت کے ایک طویل دور کا آغاز تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کے جرم میں گرفتار ہونا اور انتخابات کا غیر معینہ مدت کے لیے التوا سیاسی تعطل کا باعث بنا جس کے اثرات اور نتائج نے ادبی فضا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ادب میں علامتوں، استعاروں کے فروغ نے ادب کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا اور کہانی میں خصوصاً وجودی کیفیات (تنہائی، قید، موت، دہشت) کا اظہار نمایاں ہوا اور یوں حقیقت اور علامت کے امتزاج کو لیے کہانی آگے بڑھنے لگی۔ بقول رشید امجد:

"پاکستان میں ۷۰ کی دہائی غالباً تخلیقی اعتبار سے ایک بھرپور زمانہ ہے۔ ۱۹۵۸ کا مارشل لاء جب ختم واتو ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہوئے جب خارجی حقائق اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگے تھے۔ ایک طرف جمہوریت کی خواہش ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی تو دوسری طرف پاکستان کو دولخت ہونے کی ہزیمت کا سامنا تھا۔ اس ہزیمت نے اُس نظریاتی ڈھانچے کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا جو قیام پاکستان کا باعث بتایا جاتا تھا۔ عدم تشخص کا سوال جو پہلے ذات کے تعین کے حوالے سے اُٹھا تھا اب قومی سطح پر حل طلب تھا اور ہماری شاعری اور افسانہ اس زمانے میں اسی دوراہے پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔"۱۹

مزاحمتی افسانے کے حوالے سے دیکھا جائے تو شفیق انجم کا افسانہ "گھنی سیاہ رات"، منشایاد کا افسانہ "کہانی کی رات"، احمد جاوید کا افسانہ "دیمک"، رشید امجد کا افسانہ "بگل والے" مزاحمتی اظہار کی اچھی مثالیں کہی جاسکتی ہیں لیکن یہی وہ دور بھی تھا جب افسانہ فنی اور ہیتی اعتبار سے تبدیلیوں کا شکار ہونے لگا۔ علامت اور تجرید لکھنے کے لیے جس فنی پختگی اور ریاضت کی ضرورت تھی وہ خام ہوتی جارہی تھی اور اس طرح ابلاغ کے مسائل سر اُٹھانے لگے اور علامتی افسانے کو ایک منفی رجحان سمجھا جانے لگا۔

"جدید افسانہ نگار ذہنی و تخلیقی سطح پر بے سمتی کا شکار ہے اس نے اپنا راستہ گم کر دیا ہے.....اس وقت تخلیقی افسانہ انتشار کا افسانہ ہے اور انتشار تخلیقی سطح پر یقیناً منفی رجحان ہے۔" ۲۰

علامت نگاری کے حوالے سے اپنی پہچان رکھنے والے قد آور نام مثلاً انتظار حسین، خالدہ حسین اور زاہدہ حنا بھی کسی حد تک اس بات سے متفق ہوتے نظر آئے کہ کہانی میں اب علامت، تجرید پر گرفت کمزور ہو رہی ہے اور پھر کہانی کی جو شکل بننے لگی اُس میں وہ ماضی کی روایت کی طرف بھی مائل نظر آئے یعنی کہانی اور پلاٹ میں ہم آہنگی اور دوسری طرف موضوع کی گہرائی اور معنویت کو برقرار رکھنے کے لیے علامت اور تجرید سے استفادہ جاری رہا اور یوں عالمی و ملکی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کی تصویر کشی بھرپور انداز سے کی گئی جن میں نائن الیون اور اس کے پس منظر میں موجود دہشت گردی جیسا موضوع بھی شامل تھا جس نے پلک جھپکنے میں ہی پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے ایٹمی حملوں کے بعد عالمی سطح پر ہونے والا یہ سب سے بڑا واقعہ تھا۔ دہشت گردی کی اس نئی شکل اور طریقے نے نہ صرف دنیا کا نقشہ بدل دیا بلکہ جنگ اور نفرت کی چنگاریاں ہمارے آنگنوں اور صحنوں میں آپہنچیں اور تاریخ میں "حُر" اور "مجاہد" کہلانے والے دہشت گرد قرار پائے۔ دوسری جنگ عظیم اور فرانس کے انقلاب کے بعد دُنیا کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا واقعہ تھا جس پر دنیا بھر کے ادیبوں، عسکری تجزیہ کاروں اور صحافیوں نے بے تحاشہ لکھا اور نائن الیون کے اس واقعے سے معیشت، سیاست اور مذہب کے نئے زاویے اور نئے امکانات جنم لیتے ہوئے محسوس ہوئے اور یہ واقعہ عالمی سطح پر آج تک شکوک و شبہات کا شکار اور نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے ایک چال تصور کیا جاتا ہے:

"نائن الیون کو سمجھنے کے لیے اس امر کو سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا کی اکثر جنگیں اقتصادی مفادات کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ مفادات متحارب ملک کے عوام کے نہیں بلکہ ان مالدار طبقوں کے ہوتے ہیں جو پس پردہ دنیا کے ممالک کی سیاست کو کنٹرول کرتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بڑی محنت اور عیاری سے عوام کی نظروں سے چھپایا جاتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ اور داخلی سیاست متذکرہ بالا حقیقت کی حیران کن مثال ہے۔"۲۱

Vol. 5 No.2 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

نائن الیون کے واقعے سے زیادہ متاثر ہونے والے ایشیائی ممالک خصوصاً پاکستانی تھے جو دہائیوں تک دیارِ غیر میں رہنے کے باوجود اجنبی سے ٹھہرے اور یکلخت اپنی پہچان اور شناخت گنوا بیٹھے جس سے ان کے اندر عدم تحفظ اور بے وطنی کا احساس بڑھنے لگا جس کے نتیجے میں اپنی شناخت، بقا کا احساس اور مذہب کی طرف رجحان بڑھنے لگا اور وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت کے حصول کے لیے متحرک ہو گئے۔

نائن الیون سے جڑی اس تمام صورتحال کا بیان ہمیں اردو کے بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے جنھوں نے اس واقعے کے اثرات کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا۔ پاکستان چونکہ اس واقعے سے براہِ راست متاثر ہوا اور اس کی انتقامی کارروائیوں میں امریکہ کا حلیف بنا لہٰذا اس کے اثرات اور اس کے موضوع سے افسانہ نگاروں کی وابستگی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ پاکستانی اردو افسانے کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اُس نے عالمی و قومی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے تمام سیاسی و سماجی واقعات و حادثات کو نہ صرف موضوع بنایا بلکہ ان کے پس منظر میں پوشیدہ محرکات کو بھی پوری سچائی اور اس کے خدوخال کے ساتھ پیش کیا۔ اردو افسانے کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ صدی کی تاریخی و سیاسی سچائیاں، حقیقت، علامت اور تکنیک کے مختلف زاویوں کے وسیلے سے کہانیوں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ افسانے کو ایک تاریخی دستاویز بھی بناتی ہیں اور عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں، تاریخی و سیاسی حقائق کو محفوظ بھی کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم جمشید پوری، ترقی پسند افسانہ اور افسانہ نگار، دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲، ص ۴۶۴۔

۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی سماجیات، دہلی: فروغ اُردو، ۲۰۱۱، ص ۱۱۔

۳۔ محمد افضال، ڈاکٹر، اُردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۹، ص ۳۲۔

۴۔ کرشن چندر، دو فرلانگ لمبی سڑک، مشمولہ: کرشن چندر کے سو افسانے، مرتبہ آصف نواز چوہدری، اشاعت دوم، لاہور: چوہدری اکیڈمی، ۲۰۰۶، ص ۶۳۵۔

۵۔ کرشن چندر، ان داتا، لاہور: مکتبہ اردو، بار سوم، س ن، ص ۲۳۔ ۲۲

۶۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ تاریخی و سیاسی تناظر میں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵، ص ۸۳۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۸۔ قرۃ العین حیدر، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے، مشمولہ، قرۃ العین حیدر کے بہترین افسانے، لاہور: چوہدری اکیڈمی، ۲۰۰۰، ص ۶۲۔

۹۔ ظفر الاسلام، آصف فرخی، فلسطین کا تاریخی جائزہ، مشمولہ، دنیازاد، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲۔

۱۰۔ اعجاز راہی، نئے افسانے کے بارے میں چند سوال، مشمولہ: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، مرتبہ، ڈاکٹر نوازش علی، راولپنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۱۱۔ ۲۰۱۲۔

۱۱۔ انور سجاد، ڈوب ہوا اور لُنجا، مشمولہ: استعارے، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۷۰ء، ص ۸۹۔ ۹۰

۱۲۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ تاریخی و سیاسی تناظر میں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵، ص ۲۸۵۔

۱۳۔ خالدہ حسین، سواری، مشمولہ: پہچان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۹ء، ص ۸۷۔ ۸۸

۱۴۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانہ آزادی کے بعد، مشمولہ: اردو افسانے کی روایت، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۹۱۔

۱۵۔ غلام الثقلین نقوی، چند الفاظ، مشمولہ: نغمہ و آگ، لاہور: مکتبہ عالیہ، سن، ن۔، ص ۶۔

۱۶۔ غلام الثقلین نقوی، کافوری شمع، ایضاً، ص ۲۷۔

۱۷۔ رضیہ فصیح احمد، خندق کا پودا، مشمولہ: اوراق، شمارہ خاص، جلد ۲، صفحہ ۴۵۴

۱۸۔ انتظار حسین، اندھی گلی، قصہ کہانیاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۲

۱۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات، مشمولہ: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، مرتبہ: ڈاکٹر نوازش علی، راولپنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۔

۲۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، علامتی افسانہ ایک منفی رجحان، مشمولہ: سوال یہ ہے، مرتبہ: نوشی انجم، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۱

۲۱۔ شاہد مسعود، عالمی سیاست کے مخفی حقائق، مشمولہ: پس پردہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷